قسط دوم

اُسوۂ حسینی

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

امیر المومنینؑ کا طرزِ عمل

صفین کی صلح اور رواداری کی اعلیٰ مثال

جناب امیرؑ کا طرزِ عمل بھی سیرتِ رسولؐ کا آئینہ تھا۔ ہم اس دور کے تفصیلی حالات کے بیان سے کنارہ کرتے ہوئے جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے باہمی مناظرہ کا مرکز بن گیا ہے اس دور کے متعلق اجمالاً صرف اتنا حوالہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اس دور میں کاملاً رواداری پر اس طرح عمل ہوا کہ جنگ کی کوئی مثال ملتی ہی نہیں۔ اس کے بعد ۳۵ھ میں جب مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی۔ اس وقت ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے آپ کی بیعت سے کنارہ کشی کی۔ جیسے اسامہ بن زید، حسان بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔ لیکن حضرتؑ کی طرف سے ان کے خلاف کوئی سختی نہیں ہوئی، نہ ان کو بیعت پر مجبور کیا گیا اور نہ ان کو کسی طرح کی ایذا رسانی کی گئی۔

باوجودیکہ تمام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آپ کی بیعت مکمل ہو چکی تھی، اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن آپ نے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے کسی پر کوئی سختی کی ہو۔ تاریخ اس کا پتہ دینے سے قاصر ہے۔

یہ رواداری کا بےنظیر نمونہ ہے۔

مگر جس وقت خاموشی میں حمایتِ باطل کا پہلو دیکھا۔ یعنی شام کے تخت پر معاویہ نے بحیثیت بادشاہ قبضہ رکھنے کا ارادہ کیا تو چونکہ ان کا بطور گورنر کے باقی رکھنا باطل پروری کا الزام اپنے اوپر عائد کرنا تھا۔(۱) اس لئے آپ نے خاموش۔ پھر بھی آپ نے امکانی حد تک رواداری کے مسلک سے انحراف نہیں کیا۔ آپ نے معاویہ کے نام جو خط تحریر فرمایا اس میں کوئی تشدد نہیں معلوم ہوتا، نہ لب ولہجہ میں کوئی تلخی ہے۔ صرف اتنا ہے کہ وہ پروانۂ حکومت نہیں ہے۔ اگر طرف مقابل میں رواداری کے عنصر کا کسی حد تک بھی وجود ہوتا تو یہ خط کسی طرح فتنہ وفساد کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

واقدی کی کتاب الجمل میں اس خط کا مضمون حسب ذیل ہے:

''من عبداللہ علیؑ امیر المومنین الیٰ معاویۃ بن ابی سفیان۔ اما بعد فقد علمت اعذاری فیکم و اعراضی عنکم حتی کان ما لا بدمنہ و لا دفع لہ و الحدیث طویل و الکلام کثیر او قد ادبر ما ادبر و اقبل ما اقبل فبایع من قبلک و اقبل الی فی وفد من اصحابک''

تم کو معلوم ہوگا کہ میں نے مسلمانوں کی خلافت قبول کرنے میں حجت تمام کر دی اور پوری بےتوجہی کا اظہار کیا۔ مگر وہ ہوا کہ جو ہونے والا تھا اور جس سے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

بہرحال قصہ طولانی ہے اور باتیں بہت۔ جو کچھ ہو چکنے

---

(۱)۔ ملاحظہ ہو شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ کی کتاب ''السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ'' مطبوعہ مصر ۳ میں حسب ذیل روایات۔

والا تھا وہ ہو چکا اور جو صورتیں پیش آنے والی ہیں وہ پیش ہیں۔ تم کو چاہیے کہ تمام رعایائے شام سے میری بیعت حاصل کرو اور اپنے اہلِ مملکت کے ایک منتخبہ وفد کے ساتھ میرے پاس آؤ۔(۱)

یہی پہلا خط ہے جس کے پہنچتے ہی مخالفت کی آگ مشتعل ہوگئی۔

میں دنیا کو متوجہ کرتا ہوں اور فیصلہ چاہتا ہوں کہ اس خط کے اندر کون سا لفظ رواداری کے خلاف ہے۔

مگر اس کے جواب میں جو صورت پیش آئی وہ دنیا کو معلوم ہے آپ پر قتل عثمان کا الزام عائد کیا گیا اور ایک طوفان مخالفت کا آپ کے خلاف برپا کر دیا گیا۔

خلیفہ سوم عثمان کا خون بھرا کرتا اور ان کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں سال بھر تک دمشق کے منبر پر آویزاں رہیں جس کے گرد ہزاروں آدمی نوحہ و ماتم کرتے تھے۔(۲)

اس طرح مخالفت کے جذبات کو حضرتؑ کے خلاف مشتعل کیا گیا۔فوج کشی ہوئی اور آپ سے جنگ کی تیاری کی گئی۔

اس کے بعد بھی حضرت نے متعدد خطوط کے ذریعہ سے فہمائش کی کہ معاملہ رفع دفع ہوجائے اور جنگ کی صورت نہ پیدا ہو۔لیکن اس روادارانہ طریقہ کا جواب تشدد پسندانہ طرزِ عمل سے ملا۔

آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو دمشق بھیجا کہ کسی صورت سے معاملات روبہ اصلاح ہوجائیں۔مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں تک کہ لڑائی ٹھنی اور بہت بڑی فوج آپ سے مقابلہ کے لیے میدانِ کارزار میں آگئی۔

(۱)۔(نہج البلاغہ،ج ۲،مطبوعہ مصر،ص ۱۴۰)

(۲) طبری،جلد ۵،ص ۲۳۵۔

اب ملاحظہ فرمائیے ایک طرف ایک بادشاہ ہے جو تمام مسلمانوں کے اتفاق آراء سے خلیفہ تسلیم کیا جاچکا ہے۔دوسری طرف ایک ایسا شخص ہے جس کی حیثیت اس کے قبل ایک گورنر کی تھی اور اب ایک باغی کی حیثیت سے میدان میں آیا ہے لیکن شاہانہ گھمنڈ،سخن پروری،خودداری کے بجائے صرف رواداری کے خیال سے حضرت علیؑ خود اپنی جانب سے نامہ و پیام اور گفتگوئے صلح کی ابتدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح معاملہ طے ہوجائے۔

آپ نے تین آدمیوں کو بطور وفد منتخب کیا۔بشیر بن عمرو بن محصن انصاری سعید بن قیس ہمدانی،شبث بن ربعی تمیمی اور ان لوگوں کو معاویہ سے گفتگو کے لیے روانہ کیا فرمایا جاؤ اور دعوت دو اتفاق واتحاد اور اطاعت واجتماع کی طرف۔

یہ لوگ گئے مگر جواب کیا ملا؟ یہ کہ پلٹ جاؤ،میرے پاس سے،کیونکہ میرے تمہارے درمیان میں بس تلوار فیصلہ کن ثابت ہوگی۔(۱)

یہ اس نفسیاتی حقیقت کا ثبوت ہے کہ جب طرفِ مقابل بلند ظرف نہ ہو تو روادارانہ طرزِ عمل سے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارا مقابل دب گیا ہے اس لیے تشدد میں اضافہ کردیتا ہے۔

اب جنگ کا دن آیا۔صف آرائی ہوئی اور طرفین کی فوجیں باہمدگر مقابل ہوئیں۔مگر امیرالمومنینؑ کی یہ تاکید ہے کہ ہماری طرف سے جنگ شروع نہ ہو۔جب اس طرف سے حملہ کی ابتدا ہوگئی اور جنگ ہونے لگی۔جس کا سلسلہ طویل عرصہ تک قائم رہا۔اس درمیان میں بھی حضرتؑ کی طرف سے موعظہ و ہدایت اور نصیحت وفہمائش کا سلسلہ جاری رہا۔جس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہوا۔آخر سب سے آخری لڑائی ہوئی لیلۃ الہریر میں جو دن رات جاری رہی صبح ہوتے ہوتے شام کی فوج کا ستھراؤ ہوگیا اور بقیہ جماعت کے قدم اٹھ چلے اور اب حاکمِ شام کو

(۱) طبری،ج ۵،ص ۲۴۳

ضرورت محسوس ہوئی کہ جنگ موقوف کی جائے تا کہ وہ انتہائی شکست جس کی توقع بہت قریب تھی ہونے نہ پائے۔

اس کے لیے قرآن نیزوں پر بلند کیا گیا اور آواز دی گئی کہ ''**ھٰذا کتاب اللہ عزّ و جلّ بیننا و بینکم من لثغور اھل الشام بعد اھل الشام و من لثغور اھل العراق بعد اھل العراق**''۔

بھائیو! یہ کتاب خدا ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ شام والے سب ہلاک ہو گئے۔ پھر شام کے حدود کی کون حفاظت کرے گا اور عراق والے بھی ہلاک ہو گئے، پھر عراق کے حدود کا کون مالک ہوگا؟

امیر المومنینؑ پہلے ہی کتاب خدا کی طرف دعوت دے چکے تھے جیسا کہ آپ کی اس تقریر میں ہے جو آپ نے نمائندگانِ شام حبیب بن مسلم فہری و شرجیل بن سمط و معن بن یزید بن اخنس کے سامنے فرمائی تھی۔ اس میں آپ نے کہا تھا ''**الا انی ادعوکم الیٰ کتاب اللہ عزّ و جل و سنّة نبیّه و امانة الباطل و احیاء معالم الدین**''۔

''میں تم لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ اور باطل کو پامال کرنے اور حق کو زندہ کرنے کی جانب(۱)''

لیکن اس وقت آپ کی یہ دعوت مسترد کر دی گئی۔ اب جس وقت کہ جنگ کا آخری نتیجہ اپنی بھیانک شکل میں اہلِ شام کے سامنے ہے تو اب وہ کتاب خدا کی طرف دعوت کی آواز بلند کرتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ اس میں سچائی ہے اور نہ حقانیت۔

اس لئے اللہ امیر المومنینؑ کا اس وقت خوشی کے ساتھ اس دعوت کو منظور کر لینا اور جنگ کو اس آخری فیصلہ کن نتیجہ کے قریب پہنچ کر ختم کر دینا دشمن کے ہاتھ سے بیوقوف بن جانا ہو جاتا۔

اس لئے حضرتؑ نے اس بے وقت کی تحریکِ التوائے جنگ پر رضامندی ظاہر نہ فرمائی مگر کوفہ کی منافق جماعت نے جو آپ کے لشکر میں داخل تھی فتنہ و فساد برپا کر دیا اور کہا کہ ہم قرآن کے سامنے کسی طرح ہاتھ نہ اٹھائیں گے اور قرآن نیزوں پر بلند ہو جانے کے بعد کسی طرح جنگ نہ ہونے دیں گے۔

امیر المومنینؑ نے دیکھا کہ اب ایک دوسرا فتنہ کھڑا ہو رہا ہے اس لئے آپ نے سکوت اختیار کیا اور جنگ ملتوی ہو گئی۔ دو شخص طرفین کی جانب سے حکم مقرر کئے جانے لگے کہ وہ قرآن مجید پر نظر ڈال کر حقیقت کا فیصلہ کریں۔

شام کے لوگوں نے عمرو بن عاص کو تجویز کیا۔ بلا شبہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ امیر المومنینؑ کو حق دیا جاتا کہ کسی ایسے شخص کو معین فرمائیں جس پر آپ کو کامل اعتماد ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنی جانب سے عبداللہ بنؓ عباس اور پھر مالک بن اشتر کا نام پیش فرمایا۔ مگر بے انصاف ساتھ والے افراد نے کہا کہ یہ لوگ تو آپ کے ساتھ ''یک جان و دو قالب'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ہرگز ایسے اشخاص کو حکم بنانے پر تیار نہیں بلکہ ابوموسیٰ اشعری کو حکم بنائیں گے جو جنگ کے معاملہ میں غیر جانبدار رہے ہیں۔ حضرتؑ نے انتہائی کبیدگی سے فرمایا کہ ''اچھا جو تمہارا جی چاہے کرو مجھ سے مطلب نہیں۔''

صلح نامہ لکھا جانے لگا۔ حدیبیہ کے واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس طرح کہ جب امیر المومنینؑ صلح نامہ کے شروع میں لکھوانے لگے۔

''**بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما تقاضی علیه علیٰ امیر المؤمنین**''

''یہ وہ ہے جس پر صلح کی علی امیر المومنینؑ نے'' تو عمرو بن عاص نے کاتب سے کہا:

''**اکتب اسمه و اسم ابیه ھو امیرکم فامّا امیرنا**

---

(۱) طبری، جلد ۶، ص ۴

فلا ''ان کا اور ان کے باپ کا بس نام لکھو۔ وہ تمہارے امیر ہوں گے، ہم نے انھیں امیر تھوڑی تسلیم کیا ہے۔'' اس کی وجہ سے صلح میں تعطل پیدا ہونے ہی والا تھا کہ حضرت علیؑ نے اپنے پیش رو حضرت پیغمبر خداؐ کی تاسی میں فرمایا کہ ''امیر المومنینؑ کا لفظ محو کر دو'' اور کہا۔ ''**الله اکبر سنّة بسلّتم و مثل بمثل و الله انی لکاتب بین یدی رسول الله صلی الله علیه و سلم یوم الحدیبیة اذ قالوا لست رسول الله و لا تشهد لک به و لکن اکتب اسمک و اسم ابیک فکبة**''۔

''اللہ اکبر! یہی واقعہ ہو بہو پہلے بھی پیش ہو چکا ہے حدیبیہ میں کہ رسالت مآبؐ کے سامنے صلح نامہ لکھ رہا تھا۔ جب ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کے ''رسول اللہ'' ہونے کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا آپ بس اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیے۔ حضرت نے یہی لکھوایا اور ''رسول اللہؐ'' تحریر نہیں کیا۔

اس کے بعد لکھا گیا کہ:

''علی بن ابی طالبؑ ذمہ داری لیتے ہیں، اہل کوفہ اور دیگر ان لوگوں کی جو ان کے ساتھ ہیں مسلمانوں میں سے اور معاویہ نے ذمہ داری لی ہے۔ اہل شام اور دیگر ان اشخاص کی جو ان کی طرف ہیں اس قرارداد کے اوپر کہ ہم خدا اور اس کی کتاب پر دارومدار رکھتے ہیں اور سوائے کتابِ خدا کے کوئی شئے ہم میں فیصلہ کن نہیں ہے اور خدا کی کتاب ہمارے سامنے رہے گی، شروع سے لے کر آخر تک ہم زندہ کریں گے اسی بات کو جسے کتابِ خدا زندہ کرے اور مردہ کریں گے اس کو جسے کتابِ خدا مردہ کرے۔ طرفین کے حکم کتابِ خدا پر نظر ڈالیں گے اور جو کچھ کتابِ خدا سے ثابت ہوا اس پر عمل کریں گے اور اگر بعد بحث و تذکرہ اور تبادلۂ خیالات، کتابِ خدا میں کچھ نظر نہ آئے تو رسالت مآبؐ کی متفقہ سنّت پر جس میں اختلاف و افتراق نہ ہو عمل کیا جائے گا۔''

اس کے بعد دوسرے جزئی شرائط لکھے گئے جو امن و امان اور اجتماعِ حکمین وغیرہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس معاہدہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرتؑ نے حقیقتاً کتابِ الٰہی کو حکم قرار دیا تھا اور یہ کوئی تازہ بات نہ تھی جس کے آپ اس تحریر کی وجہ سے پابند ہوئے ہوں۔ بلکہ ہر وقت ہی آپ کتابِ خدا کے فیصلہ کے لئے تیار تھے۔

حکمین کا ذاتی فیصلہ جو کتابِ خدا کی بنیاد پر نہ ہو کسی طرح اس قرارداد صلح کی رو سے جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ آپ نے خود حکمین سے جو فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے تھے، صاف طور سے ارشاد فرمایا تھا۔ ''**احکما علیٰ ان تحکما بکتاب الله و کتاب الله کلّه معی فان لم تحکما بکتاب الله فلا حکومة لکما**۔''

''تم حکم ہو، مگر اس شرط سے کہ کتاب اللہ کی رو سے فیصلہ کرنا اور یہ یقینی ہے کہ کتابِ خدا کل کی کل میرے ساتھ ہے۔ اگر تم کتابِ خدا کی رو سے فیصلہ نہ کرو تو تمہاری حکومت تسلیم نہیں ہو سکتی۔''(۱)

یہی وہ پہلو تھا جس سے یہ ''رواداری و امن پسندی'' حق پروری اور حمایتِ باطل سے علیٰحدگی'' کے اصول سے ٹکراتی نہ تھی۔ مگر تمام طبیعتیں اس سے راضی ہوتیں ناممکن۔

ایک جماعت ایسی تھی جو اسی وقت برافروختہ ہو گئی اور کہا یہ صلح ذلّت کی صلح ہے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن ابی طالبؑ خود اپنی حقیقت میں شک رکھتے ہیں۔ ''**لا حکم الا الله**'' حاکم سوائے خدا کے کوئی نہیں۔

اس بنیاد پر خوارج کے مذہب کی عمارت قائم ہوئی۔

صلح ہونا، مخالفت ہونا، لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہونا، یہ تمام پرانی ہی باتیں ہیں۔ جو حدیبیہ میں ہمارے سامنے آ چکی ہیں وہی یہاں بھی پیش ہوئیں۔

جس طرح وہاں رسالت مآبؐ نے خلاف ورزی معاہدہ

---

(۱) اسد الغابہ، ابن اثیر جزری، ج،، ۳، ص ۲۴۶

سے یہ کہہ کر انکار فرمایا تھا کہ ہم نے عہد کیا ہے اس کی مخالفت نہیں کریں گے اسی طرح امیر المومنینؑ کا جواب تھا چنانچہ زرعۃ بن برج طائی اور حرقوص بن زہیر سعدی سے فرمایا:

''قد کتبنا بیننا وبینھم کتابا وشرطنا شروطا واعطینا علیھا عھودنا مواثیقنا وقد قال اللہ عزوجل واوفوا بعھداللہ اذاعا ھدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکید ھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ یعلم ما تفعلون''

''ہم نے نوشتہ دے دیا ہے، شرائط قرار دیے ہیں، عہد و میثاق کرلیا ہے۔ اب اس کی مخالفت ممکن نہیں ہے۔ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے۔ وفا کرو عہد و پیمان کے ساتھ اور نہ توڑو اپنی قسم کو جب کہ تم نے اسے مضبوط کر دیا ہے اور خدا کو اس کا ضامن بنا دیا ہے اور یقیناً خدا تمہارے افعال و اعمال پر مطلع ہے۔''

لیکن اس کے بعد صورتِ حال کیا نمایاں ہوئی ؟ یہ کہ حکمین کے فیصلہ کو جس معیار پر مبنی قرار دیا گیا تھا وہ نہیں ہوا۔ نہ کتاب خدا سے کوئی مطلب رکھا گیا نہ اس میں نظر و فکر کی ضرورت سمجھی گئی ۔ بلکہ حکمین نے خود آپس میں ایک سمجھوتہ کر کے اس پر متفق ہونے کی سازش کی اور پھر وہ بھی ناکام رہی اور اختلاف کا اختلاف ہی قائم رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابوموسیٰ بھولے بھالے آدمی تھے اور امیر المومنینؑ سے کوئی خاص خلوص بھی نہ رکھتے تھے، اور عمرو بن عاص سمجھدار چالاک جہاندار و آزمودہ کار اور پھر معاویہ کے خیر خواہ اور وفادار بلکہ روح ورواں اور یک جان و دو قالب، جب زمانہ حکمین کے اجتماع کا قریب پہنچا تو ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص دونوں آدمی مقام دومۃ الجندل میں جو کوفہ و شام کے درمیان بالکل وسط میں واقع تھا اور یہیں اجتماع کی قرارداد ہوئی تھی مجتمع ہو گئے روزانہ ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ قائم ہو گیا، عمرو نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب گفتگو ہو تو ابوموسیٰ اشعری کو اپنے اوپر مقدم قرار دیں اور یہ کہیں کہ آپ بزرگ ہیں اور رسالت مآبؐ کی صحابیت کا مجھ سے زیادہ شرف رکھتے ہیں آپ پہلے تقریر کیجیے پھر میں کہوں گا۔

اس طرح عمرو عاص نے ابوموسیٰ اشعری پر اپنی ادب شناسی کا اثر قائم کیا اور اپنے خلوص و محبت کا اظہار کیا۔ مسئلہ متنازع فیہ کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا اور رائے یہ قرار دی گئی کہ دونوں طرف کے حکم دونوں طرف کے امیروں کو معزول کر دیں یعنی معاویہ تختِ شام سے اور امیر المومنینؑ تختِ عراق و حجاز سے، دونوں شخص علیحدہ ہو جائیں اور پھر مسلمانوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ از سرِ نو جس شخص کو چاہیں منتخب کر لیں۔''

ابوموسیٰ اور عمرو عاص نے اس رائے کو آپس میں مشورہ کر کے طے کیا اور جب فیصلہ کا وقت آیا اور طرفین کے لوگ فیصلہ سننے کو مجتمع ہوئے عمرو عاص نے حسبِ عادت ابوموسیٰ اشعری سے کہا۔ ''بسم اللہ فرمائیے جو کچھ آپ کی رائے ہے۔'' ابوموسیٰ کی عادت تو پہلے سے پڑی ہوئی تھی ہی، تقریر کے لیے آمادہ ہو گئے اور خیال نہ کیا کہ اس میں کوئی بات نہ ہو۔ باوجودیکہ عبداللہ بن عباس جو سمجھدار شخص تھے انھوں نے ابو موسیٰ سے کہا کہ دیکھو عمرو عاص نے تمہیں کہیں فریب نہ دیا ہو۔ پہلے عمرو عاص کو تقریر کر لینے دو پھر تم تقریر کرنا، مگر ابوموسیٰ نے کہا کہ نہیں ہم متفق ہو چکے ہیں اور کوئی اختلاف نہیں ہے۔'' اس کے بعد کھڑے ہو گئے اور حمد وثناء کے بعد کہنے لگے کہ ''ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد بہترین رائے جو قرار دی ہے جس میں افتراق و اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم دونوں آدمی، علیؑ و معاویہ دونوں کو معزول کر دیں اور مسئلہ خلافت کو از سرِ نو مسلمانوں کے انتخاب کے حوالہ کر دیں کہ جسے وہ چاہیں منتخب کر لیں۔''

ابوموسیٰ نے یہ تقریر کی اور بیٹھ گئے۔ عمرو عاص کی باری آئی، وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

''حضرات! آپ لوگوں نے ابو موسیٰ کی تقریر سنی، انھوں نے نمائندہ علیؑ ہونے کی حیثیت سے علیؑ کو معزول کر دیا۔ میں حاکمِ شام کا نمائندہ ہوں، میں بھی علیؑ کی معزولی سے متفق ہوں، مگر حاکم شام کو برقرار رکھتا ہوں۔''

ابو موسیٰ برافروختہ ہو گئے، کہنے لگے۔

''مالک لا وفقک الله غدرت وفجرت انما مثلک کمثل الکلب ان تحمل علیه بلهث او تترکه یلهث''

''یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، تو نے غداری کی، بے ایمانی کی، تو کتّے کی طرح ہے کہ چاہے اس پر حملہ کرو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بھونکنے سے باز نہ آئے گا۔

عمرو عاص نے جواب دیا۔''

''انما مثلک کمثل الحمار یحمل اسفارا''

''تمہاری مثال گدھے کی ہے جس کی پشت پر کتابیں لاددی گئی ہوں۔''

جلسہ انہی تہذیب و اخلاق کے مظاہروں پر ختم ہو گیا۔ قریب تھا کہ کشت و خون کی نوبت آجائے لیکن غنیمت یہ ہے کہ مجمع اسی افتراق و پراگندگی کے ساتھ منتشر ہو گیا اور زبانی جنگ سے آگے نہیں بڑھا۔

قرارداد یہ تھی کہ کتابِ خدا پر نظر ڈالی جائے گی۔ بحث و تمحیص کے بعد جس بات پر دونوں طرف کے حکم متفق ہوں گے وہ عمل میں لائی جائے گی۔ مگر اتفاق کی صورت پیدا ہی نہیں ہوئی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی بھی فریق اس فیصلہ کو جائز نہیں سمجھتا ہے اور شیعہ ہوں یا سنّی کوئی مخالفت نہیں ہے۔ سب ہی کہتے ہیں کہ فیصلہ کھلونا بن کر رہ گیا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرات اہل سنّت معاویہ کی خلافت کا امام حسنؑ کی صلح سے حساب کرتے ہیں۔ اس سے قبل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اگر یہ فیصلہ ناطق ہوتا تو اسی وقت سے خلافتِ معاویہ تسلیم کر لی جاتی۔

اس صورتِ حال کے معنی یہ تھے کہ معاہدہ کے دفعات پامال ہو گئے اور قرار دادِ صلح کے حدود ختم ہو گئے۔ اس لئے امیر المومنینؑ پھر جنگ پر آمادہ ہوئے اور فوج کو حکم دیا۔

بہر حال وہی طرزِ عمل کہ کبھی صلح اور کبھی جنگ، جنگ کا موقع ہوتا ہے تو ہمت و جرأت سب کا مظاہرہ اعلیٰ شان سے اور صلح کا موقع ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بازوؤں میں طاقت اور دل میں جوش پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔

فرزندِ رسولؐ حضرت امام حسنِ مجتبیٰؑ امن پسندی رواداری کے ساتھ حق کی حمایت کا اعلیٰ مظاہرہ

رسولؐ کا زمانہ گذر گیا۔ امیر المومنینؑ کا دور بھی ختم ہوا۔ اب وقت ہے فرزندان رسولؐ یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا۔ امام حسنؑ نے دیکھا کہ مسلمانوں کا خون بہت بہ چکا ہے معاملات حد سے زیادہ طول پکڑ چکے ہیں اور پیمانۂ تحمل لبریز ہو چکا ہے مسلمانوں میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اب زیادہ زمانہ تک خونریزی کے نتائج کو برداشت کریں آپ نے صلح کی۔ صلح کے شرائط قرار پائے اور میں ان شرائط صلح کو یہ دکھلانے کے لئے پیش کرنا ضروری سمجھوں گا کہ آپ نے امن پسندی کے مقصد کے لئے حمایتِ باطل سے علیٰحدگی کے پہلو کو ترک نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ اس پہلو کی کامل حفاظت فرمائی ہے۔

یہ امام حسنؑ کا طرزِ عمل یعنی صلح ایسا ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلمان اس کے حق بجانب ہونے پر متفق ہیں۔ شیعہ! وہ تو بہرحال یہ کہتے ہیں کہ امامؑ کا طرزِ عمل ہے۔ لہٰذا وہ حق بجانب ہے۔

معصوم سے کسی غلطی کا ہونا ممکن نہیں۔ آپ نے صلح کی تو

موقع تھا صلح کا جب ہی صلح فرمائی۔ حضرات اہل سنّت بھی اس امر سے اتفاق رکھتے ہیں اور جوامع حدیث میں ایک حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ امام حسنؑ کے متعلق کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا تھا: ''**ابنی ھذا سید یصلح اللہ بہ بین فئتین من المسلمین**''

''یہ میرا بیٹا سید و سردار ہے خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا۔''

لیکن یہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہیں جو اس صلح کی پسندیدگی پر اتفاق رکھتے ہیں مگر اس زمانہ میں کہ جب صلح واقع ہوئی تھی وہی صورتیں نظر آرہی تھیں جو رسالت مآبؐ کی صلح میں پیش آئیں اور امیرالمومنینؑ کی صلح میں رونما ہوئیں۔

ایک بہت بڑی جماعت خلاف ہوگئی اور اس نے کہا کہ آپ نے کمزوری سے صلح کر لی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ کو ''**السّلام علیک یا مذل للمومنین**'' کے الفاظ سے سلام کیا گیا۔

جس طرح رسالت مآبؐ سے کہا گیا۔ ''**الست رسول اللہ فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا**'' کیا آپ خدا کے رسول نہیں ہیں۔ پھر آخر ہم اپنے مذہب کی ذلت کو کس لئے برداشت کریں۔

رسولؐ کی صلح کو اسلام اور مسلمانوں کی ذلت قرار دیا جارہا تھا اسی طرح حسن مجتبیٰؑ کی صلح کو تمام مسلمانوں کی ذلت سے تعبیر کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ:

''سلام ہو آپ پر اے تمام مومنین کے باعث ذلّت ہونے والے'' لیکن وہ رواداری کی طاقت تھی کہ ان تمام باتوں پر بھی کچھ اعتناء نہ کی، ان تمام چیزوں کو برداشت کیا، لیکن صلح پسندی سے نہ ہٹے۔

بے شک شرائط صلح میں اس بات کا خیال رکھا کہ حمایتِ باطل کا پہلو بھی پیدا نہ ہو اور ضلالت و گمراہی کی اشاعت کی بھی اپنے اوپر ذمہ داری نہ عائد ہو۔

صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی(۱) میں جو صلح نامہ کا مضمون درج ہے وہ حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما صالح علیہ الحسن بن علی معاویۃ بن ابی سفیان صالحہ علی ان یسلّم الیہ ولایۃ المسلمین (شیعوں کے عقیدہ میں ''امامت'' جو چیز ہے وہ نفسانی صفات کا نتیجہ اور خدا کی طرف کا منصب ہے۔ وہ انسان کے ساتھ خدا کی مخصوص کی ہوئی ایک بات ہے جو الگ نہیں کی جاسکتی۔ ایک عالم کا علم جس طرح اس قابل نہیں کہ بیع ہو سکے، شراء ہو سکے اور ایک نبی کی نبوت، رسول کی رسالت، بیع و شراء کی صلاحیت نہیں رکھتی اسی طرح امامت ایک نفسانی حیثیت رکھتی ہے، وہ قابلِ انتقال نہیں ہے اور نہ عہد یا صلح کے ذریعے سے وہ ایک سے دوسرے کی طرف جاسکتی ہے بے شک ظاہری حکومت، وہ امامت سے جداگانہ چیز ہے جو امامت کی بنا پر ایک امام کا حق ہے، یہ حق منتقل بھی ہوسکتا ہے اور اس کے متعلق عہد و صلح، پیمان و قرارداد کا موقع بھی ہے، اس کا رہنا یا منتقل ہوجانا امامت میں کسی تفریق کا باعث نہیں ہے۔ جس طرح ظاہری سلطنت کی موجودگی میں امام، امام ہے اسی طرح سلطنت سے علیٰحدہ ہونے پر بھی امام کی امامت باقی ہے۔)

''صلح یہ ہو رہی ہے کہ حسنؑ بن علیؑ مسلمانوں کی حکومت کو معاویہ بن ابی سفیان کے سپرد کردیں۔''

لیکن سپرد کیونکر کریں۔ اس لئے کہ حمایتِ باطل کرنا منظور نہیں، اس لئے یہ شرط قرار دی گئی کہ **علیٰ ان یعمل فیھا بکتاب اللہ تعالیٰ و سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سیرۃ الخلفاء الراشدین المھدّیین ولیس لمعاویۃ بن ابی سفیان ان یعھدائی احد من بعدہ عھد ابل یکون**

---

(۱) مطبوعہ مصر، ص ۸۳۔

الامر من بعده شوریٰ بین المسلمین وعلیٰ ان الناس امنون حیث کانوا من ارض اللہ تعالیٰ فی شامھم وعراقھم وحجازھم ویمنھم وعلی ان اصحاب علی وشیعۃ امنون علیٰ انفسھم واموالھم و نسائھم واولادھم حیث کانوا وعلیٰ معاویۃ بن ابی سفیان بذٰلک عھداللہ و میثاقہ ان لا یبتغی للحسن بن علی ولا لاخیہ الحسین ولا لاحد من بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غائلۃ سرّا ولا حجرا ولا بخیف احدا منھم فی افق من الافاق۔

''اس شرط پر کہ معاویہ مسلمانوں کے درمیان کتابِ خدا پر عمل کریں اور سنتِ رسولؐ اللہ کا اجراء کریں اور صحیح راستہ پر چلنے والے ہدایت یافتہ خلفاء کی جو سیرت ہونا چاہیئے اس کے پابند رہیں اور معاویہ کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے بعد کسی کو بھی جانشینی کے لئے نامزد کریں اور ولی عہد قرار دیں بلکہ یہ امر ان کے بعد مسلمانوں کے شوریٰ پر موقوف ہوگا اور یہ کہ تمام لوگ امن وامان میں رہیں گے۔ شام، حجاز، عراق، یمن، جس جگہ بھی خدا کی زمین میں وہ بس گئے ہوں، اور علیؑ کے اصحاب اور ان کے شیعہ بھی اپنے جان، مال، ناموس، اولاد ہر حیثیت سے مامون ومحفوظ رکھے جائیں گے۔ جس جگہ بھی ان کا قیام ہو۔ یہ عہد ہے جو خدا کی طرف سے معاویہ کے اوپر عائد ہے اور معاویہ کسی وقت میں بھی امام حسنؑ یا ان کے بھائی امام حسینؑ یا اہل بیتؑ رسولؐ میں سے کسی اور شخص کے قتل کی ریشہ دوانی نہ کریں گے۔ خفیہ طور سے اور نہ علانیہ اور نہ کسی وقت میں ان کو قتل کی دھمکی دیں گے اور نہ خوف ودہشت کا باعث ہوں گے۔''

یہ تھے شرائطِ صلح جن پر طرفین کا اتفاق ہوا۔

جس طرح امام حسنؑ اس صلح پر رضامند تھے، اسی طرح آپ کے چھوٹے بھائی امام حسینؑ بھی اس سے متفق تھے اور ان کی رائے بھی حالاتِ وقت کو دیکھتے ہوئے امام حسنؑ کی رائے سے متحد تھی شیعوں کے عقائد کے لحاظ سے تو معصومین کی آراء میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں تو تاریخی حیثیت سے کلام کررہا ہوں۔ اس حیثیت سے بھی یہ حقیقت ثابت ہے کہ امام حسنؑ نے جو صلح کی ہے تو امام حسینؑ بھی اس سے متفق تھے۔

چنانچہ میرے پیش نظر ہے۔ تاریخ ''الاخبار الطوال'' یہ ابوحنیفہ احمد بن داؤد دینوری کی تصنیف ہے۔ جن کی وفات ۲۸۱ھ میں ہوئی ہے۔ یہ طبری کے معاصر اور ایک حیثیت سے ان سے مقدم ہیں۔ اس لئے طبری کی وفات ۳۱۰ء سنہ میں ہے۔

یہ تاریخ مصر میں چھپی ہے اور وہاں کے جامع ازہر کے مدرس علمِ تاریخ شیخ محمد خضری مشہور مصنف تاریخ خضری کے حواشی اور توضیحات کے ساتھ ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوئی ہے۔

یہ کتاب میرے سامنے ہے اور اس میں لکھا ہے کہ حجر بن عدی اور عبیدہ بن عمر جو صلحِ امام حسنؑ کے مسئلہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا:

''ابا عبداللہ شریتم الذّل بالعزّو قبلتم القلیل وترکتم الکثیر اطعنا الیوم واعصا الدھر دع الحسن وما رائ من ھذا الصلّح واجمع الیک شیعتک من اھل الکوفۃ وغیرھا وولنی وصاحبی ھذہ المقدمۃ فلا یشعر ابن ھند الاّ ونحن تقارعہ السیوف''

دیکھئے وہ ایسے الفاظ میں گفتگو کررہے ہیں جو ہر ایسے انسان کے جوش کو موجزن کردیں جس کے اقدامات جذبات کے ماتحت ہوتے ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔ ''اے ابوعبداللہ آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا۔ آپ نے کم حقوق حاصل کرکے بہت سے اپنے حقوق سے دست کشی کرلی۔ اب آپ آج ہماری بات مان لیجئے چاہے پھر کبھی نہ مانیئے گا آپ امام حسنؑ کو چھوڑ دیجئے۔ صلح پسندی کے اس مسلک کی بنا پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو

جمع کیجئے جوکوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر اور ہم دونوں آدمیوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجئے بس حاکم شام کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم تلواروں سے حملے کرتے ہوئے نظر آئیں۔"

حضرتؑ نے فرمایا یہ نہیں ہوسکتا۔ ہم عہد کر چکے قول و قرار کر چکے اب عہد شکنی ممکن نہیں اور ملاحظہ ہو علی بن محمد بن بشیر ہمدانی یہ بھی اسی جماعت میں سے ہیں جو صلح پر معترض تھی۔ ان کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلیٰ کی معیت میں مدینہ پہنچا اور امام حسنؑ کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اس وقت مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن وداک تمیمی اور سراج بن مالک خشعمی موجود تھے۔

میں نے کہا: "**السلام علیک یا مذل المومنین۔**

آپ نے اس طرح کے سلام کا جواب بھی ضروری سمجھا اور فرمایا۔ **وعلیک السلام اجلس لست مذل المؤمنین ولکنّی معزھم ما اردت بمصالحتی معاویة الا ان ادفع عنکم القتل عند ما رأیت من تبا طئ اصحابی عن الحرب ونکولھم عن القتال واللہ لئن سرنا الیہ بالجبال والشجر ما کان بد من افضاءھذا الامر الیہ**"،

"تم پر بھی سلام ہو، بیٹھو، میں مومنین کی ذلت کا باعث ہونے والا نہیں ہوں میں تو ان کی عزت کا خواہاں ہوں، مجھے تو اس صلح سے یہ منظور تھا کہ خونریزی کا انسداد ہو اور قتل کا سلسلہ موقوف ہو، جب کہ میں نے دیکھا کہ اب جنگ کا جوش وولولہ باقی نہیں رہا ہے اور جنگ میں کمزوری ہونے لگی ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ آئندہ بھی جاری رکھی گئی۔ تب بھی نتیجہ میں ایک دن معاویہ کی بادشاہت قائم ضرور ہوجائے گی۔"

یہ حضرتؑ نے اپنے مخاطب کی مذاقِ طبیعت کے موافق کلام فرمایا اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اٹھ کر امام حسینؑ کے پاس گئے اور حضرتؑ سے پوری گفتگو امام حسنؑ کی بیان کی۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ **صدق ابو محمد فلیکن کل رجل منکم جلسا من اجلاس بیتہ ما دام ھذا الانسان حیّا۔۔۔**

"سچ کہا ابو محمد (حضرت حسنؑ) نے تمہیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے اس طرح گھر میں بیٹھ جائے جس طرح وہ فرش جو سب سے نیچے بچھایا جاتا ہے۔ جیسے چٹائی جو بدلی نہیں جاتی اور اٹھتی نہیں ہے اس وقت تک کہ جب تک یہ شخص یعنی حاکمِ شام معاویہ زندہ رہے۔"

یہ ہیں وہ واقعات جن سے حقیقتِ حال بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ ان لوگوں کا خیال غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ صلح سے راضی نہ تھے۔ آپ کا طرزِ عمل بھی یہی بتلاتا ہے کہ صلح پر آپ نے قیام کیا۔ جنگ کی کوئی تیاری نہیں کی۔

دس برس آپ کو امام حسنؑ کی معیت میں گزرے۔ ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ بھائی کے دباؤ سے آپ صلح پر قائم رہے۔ لیکن امام حسنؑ کے بعد بھی دس برس تک آپ خاموش نظر آتے ہیں۔ جبکہ شیعی عقائد کے مطابق امامت آپ کی طرف منتقل ہوچکی تھی۔

امام حسنؑ کی زندگی خاموشی سے گزری، کسی قسم کا تعرض نہیں۔ کوئی جنگ کی صورت نہیں۔ لیکن معاہدہ جو ہوا تھا وہ کہاں تک پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ اس پر کس حد تک عمل ہوا؟ اس کو تاریخ کا دیکھنے والا بچہ بچہ خوب جانتا ہے۔

میں اگر تاریخی واقعات کو تفصیل سے پیش کرنا چاہوں تو وقت وفرصت میں گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا مختصر طور سے یہ دکھانا ضروری سمجھتا ہوں کہ شرائطِ صلح جو قرار پائے تھے ان پر عمل نہیں ہوا۔

یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جنھیں کوئی کہے اور کوئی انکار کرے بلکہ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جو انکار کے قابل نہیں ہیں۔

پہلی شرط معاہدہ کی یہ ہے کہ "**ان یعمل فیھا بکتاب اللہ وسنة رسول اللہ وسیرة الخلفاء الراشدین المھدیین**" عمل ہونا چاہیئے کتابِ خدا پر اور رسالت مآبؐ کی سنّت پر اور

ایسے خلفاء کی سیرت پر جو راشدین و مہدیین سمجھے جاسکیں''

اس پر کہاں تک عمل ہوا اور کہاں تک نہیں ہوا؟ اس کا بیان بہت طویل الذیل ہے میں مختصر طور سے یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ یہ شرط پوری نہیں ہوئی۔ خود شیعوں کا جو عقیدہ ہے وہ تو ہے ہی۔ میں نے اس وقت عقائد شیعہ کی تبلیغ کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ اس کے دوسرے مواقع ہیں لیکن عام اسلامی نقطۂ نظر اور اکثریتِ مسلمین یعنی سوادِ اعظم کے زاویہ نگاہ سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کے بعد صرف تیس برس تک خلافتِ راشدہ کا دَور رہا ہے۔ ایک حدیث بھی اس کے متعلق بیان کی جاتی ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا: ''**ان الخلافة بعدی ثلثون سنة**''۔

یہ تیس برس کی مدّت پوری ہوجاتی ہے اس چھ مہینہ تک جس میں امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ سے خلافت کا تعلق رہا ہے اور بس اس کے بعد سے یعنی جب سے کہ آپ نے معاویہ کے ساتھ صلح کر کے خلافت ان کے سپرد کی۔ وہ تیس برس کی مدّت ختم اور خلافت کا زمانہ منقضی ہوگیا۔ بس اس کے بعد ملوکیت ہے۔ جہانبانی ہے، دنیاداری ہے مگر خلافت نہیں ہے۔

غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتابِ خدا سنتِ رسولؐ اور راشدین و مہدیین خلفاء کی سیرت پر عمل ہو تو معاویہ کی حکومت خلافتِ راشدہ کے حدود سے خارج کیوں قرار پائی۔

عمر بن عبدالعزیز کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ ان کا زمانہ ملحقاتِ خلافت راشدہ سے ہے۔ مگر فاصلہ ہوجانے کی وجہ سے اس میں محسوب نہیں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی سیرت اپنے ہمنام حضرت خلیفہ ثانی کی سیرت سے ملتی جلتی ہے۔ لہٰذا ان کی حکومتِ راشدہ خلافت کے نام کی مستحق ہے۔ مگر معاویہ کے دورِ حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا تھا۔

پھر اب میں واقعات کا جائزہ لے کر کیا کروں۔ جب کہ ایک صحیح متفقہ علمی فیصلہ میرے سامنے آگیا ہے جس پر تمام مسلمانوں کی مہر تصدیق ثبت ہے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ ''تمام لوگ امن و امان میں رہیں گے اور صبر و سکون کی فضا میں سانس لے سکیں گے۔'' اس کے متعلق تاریخی کتب کے صفحات انتہائی تاریک مرقع پیش کر رہے ہیں۔

زیاد بن سمیہ کی حکومت عراق میں اور اس کے بعد سے جو واقعات پیش آئے ہیں وہ ایک مختصر وقت میں تذکرہ کے قابل نہیں ہیں۔

حجرؓ بن عدی اور ان کے چھ ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیئے گئے حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور بغاوت نہیں کر رہے ہیں مگر وہ باوجود اس کے اس عظیم جرم کی بناء پر قتل کر دیئے گئے۔ جس کا نام ہے محبتِ اہلِ بیتؑ۔ ان کے متعلق نہ حلم میں کوئی گنجائش تھی نہ رحم و کرم ان پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔

یہ واقعہ ایسا تھا جس پر تمام عالمِ اسلام نے اظہارِ تاسّف کیا اور غم و غصہ کا اظہار کیا۔

یہ حجرؓ بن عدی کون تھے؟ استیعاب میں ہے ''**کان من فضلاء الصحابة**'' یہ صحابۂ کرام کے اندر افاضل میں محسوب ہیں۔ ''**کتب فیه زیاد الیٰ معاویة فامره ان یبعث به الیه فبعث الیه مع وائل بن حجر الحضرمی فی اثنی عشر رجلا کلهم فی الحدید فقتل معاویة منهم سنة واستحیی سنة وکان حجر ممن قتل**''۔ ان کے بارے میں زیاد نے حاکم شام کو شکایت کا خط لکھا۔ حکم دیا گیا کہ ان کو شام کی طرف بھیج دو۔ یہ بارہ آدمی تھے جو لوہے میں جکڑ کر شام

کی طرف بھیج دیئے گئے۔

معاویہ نے چھ آدمیوں کو قتل کیا اور چھ آدمیوں کو چھوڑ دیا اور حجر بن عدی بھی ان میں تھے کہ جو قتل کئے گئے۔''

اب ان کی ہر دلعزیزی ملاحظہ ہو۔''**فبلغ ما صنع بهم زیاد الیٰ عائشة فبعث الیٰ معاویة عبدالرحمٰن بن الحارث بن هشام**''''زیاد کی مخبری کی اطلاع ام المومنینؓ عائشہ کو پہنچی۔'' آپ نے عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ حاکم شام کے پاس روانہ کیا۔''**الله الله فی حجر و اصحابه**'' خدا سے خوف کرنا حجر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں۔'' مگر افسوس ہے کہ عبدالرحمن اس وقت پہنچے جب حجر اپنے پانچ ساتھیوں کی معیت میں قتل ہو چکے تھے۔ عبدالرحمن نے معاویہ سے کہا۔''**عزب عنک حلم ابی سفیان فی حجر و اصحابه الا جستهم فی السجون و عرضتهم للطاعون**''۔ آپ کے پاس سے کہاں گیا تھا ابوسفیان سے ملا ہوا حلم؟ آپ نے اس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپ نے ان کو جیل خانے ہی میں قید کر دیا ہوتا اور وباء وطاعون سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔''

حاکم شام نے (شاید طنز کے طور پر) جواب دیا۔

''**حین غاب عنی مثلک من قومی**'' تمہارا جیسا کوئی مشورہ دینے والا موجود نہ تھا، اس لئے ایسا ہوا۔'' عبدالرحمن نے کہا،'' **والله لا تعدّ لک العرب حلما بعدها ابدا و لا رأیا قتلت قوما بعث بهم الیک اساری من المسلمین**'۔

''اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حلم کا کوئی ذکر ہوگا اور نہ آپ کی اصابت رائے قابلِ تسلیم رہی ہے۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کر کے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے''۔

جب معاویہ مدینۂ رسولؐ میں آئے اور حضرت عائشہ کے پاس سلام کے لئے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو ام المومنین نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے اپنی جرأت و دیدہ دلیری سے کہا۔''**فذعینی و حجرا حتی تلبقی عند ربنا**''۔

''اچھا پھر چھوڑ دیجئے مجھے اور حجر کو، خدا کے یہاں دیکھا جائے گا۔''

یہ تھی اہمیت اس قتل کی ام المومنین کی نظر میں۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ آپ بازار میں تشریف رکھتے تھے۔''**فنعی الیه حجر فاطلق حبرته وقام وقد غلب التحیب**'''' آپ کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو آپ بے چین ہو گئے، نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چیخیں مار مار کر رونے لگے۔''

محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ جب حجر بن عدی کو سزائے موت سنائی گئی۔''**قال دعونی اصلّی رکعتین**۔'' انھوں نے کہا مجھے اتنی اجازت دو کہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔'' اجازت ملی، انھوں نے دو رکعت نماز اختصار کے ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد کہا۔''**لو لا ان تظنّوا بی غیر الذی بی لا طلتهما**'' اگر تم کو یہ خیال نہ پیدا ہوتا کہ میں قتل کے خوف سے نماز میں طول دے رہا ہوں تو میں نماز اتنی جلدی ختم نہ کرتا۔''

محمد بن سیرین سے سوال کیا جاتا تھا کہ مقتول کو اپنی موت سے پہلے نماز پڑھنا چاہیئے یا نہیں۔ تو وہ جواب دیتے تھے کہ''**صلاتها جنیب و حجر و هما فاضلان**'' جنیب اور حجرؓ دونوں آدمیوں نے اپنے قتل کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی اور یہ دونوں فاضل شخص تھے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کا فعل ہمارے لیے سند ہے۔''

حسن بصری کے متعلق مذکور ہے کہ ان سے معاویہ اور قتلِ حجر کا تذکرہ ہوا تو انھوں نے کہا۔''**ویل لمن قتل حجر و اصحابه**'' وائے ہو اس پر جس نے حجر اور ان کے اصحاب کو

قتل کیا۔''

امام احمد بن حنبل نے اپنے استاد یحیٰی بن سلیمان سے دریافت کیا کہ کیا حجر بن عدی مستجاب الدعوہ تھے؟ تو انھوں نے کہا۔''**نعم و کان من (فاضل اصحاب النبی)** ہاں اور فاضلِ اصحابِ رسولؐ میں سے تھے۔''

ام المومنین عائشہ نے جو پیغام بھیجا تھا اور پھر جو زبانی گفتگو حاکم شام سے فرمائی اس کا تذکرہ ہو چکا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ آپ نے اپنے مقام پر حجر کے قتل کے متعلق کس طرح اظہارخیال کیا۔ آپنے فرمایا:

''**اما واللہ لو علم معاویۃ ان عند اھل الکوفہ منعۃ ما احبرّ أعلیٰ ان یأخذ حجرا و اصحابہ من بینھم حتیٰ یقتلھم بالشام ولٰکن ابن أکلۃ الاکباد علم انہ قد ذھب الناس اما واللہ ان کانوا الجمجمأ العرب منعۃ وفقھا وللہ در لبید حیث یقول**''

ذھب الذین بعاش فی اکنافھم
وبقیت فی خلف کجلدالاجرب
لاینفعون ولا یرجّی خیرھم
ویعاب قائلھم وان لم یشتب

''اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کوفہ میں کچھ بھی جرأت و ہمت ہے تو وہ کبھی حجرؓ اور ان کے اصحاب کو گرفتار کرنے کی جرأت نہ کرتا کہ شام میں بلوا کر انھیں قتل کرے لیکن جگرخوارہ کے لڑکے کو معلوم تھا کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں، خدا کی قسم یہ لوگ اپنی طاقت اور مفتی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سراور دماغ سمجھے جاسکتے تھے۔ لبیدؔ شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے اشعار میں جن کا مضمون یہ ہے''

''گزر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کی جاسکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں اب ایسے پسماندہ افراد میں جو خارشتی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں نہ تو ان کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ان سے کسی اچھائی کی توقع ہے، جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو، چاہے وہ شوروغل برپا نہ کریں۔''

یہ تھے تاثرات مختلف اکابر اسلام کے حجر بن عدی کے واقعۂ قتل کے اوپر ایک بزرگ تھے ربیع بن زیاد حارثی جو ابن زیاد کی طرف سے خراسان کے حاکم تھے۔ انھیں جب حجرؓ بن عدی کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو انھوں نے کہا:

''**اللّٰھم ان کان للربیع عندک خیرفا قبضہ الیک وعجل**''

''خداوندا! اگر ربیع کے لئے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اس کی روح کو قبض فرمالے۔''**فلم یبرح من مجلسہ حتیٰ مات**'' ابھی اپنی جگہ سے ہٹے نہ تھے کہ روح قبض ہوگئی اور دنیا سے مفارقت کی''۔(۱)

جب حاکمِ شام کا مرض الموت شدید ہوا تو عبداللہ بن یزید اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے دیکھا کہ آپ بہت مضطرب ہیں۔ اس نے (خوشامد کے طور پر) کہا کہ آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت؟ اگر مر گئے تو جنت میں پہنچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ معاویہ نے کہا خدا تمہارے باپ پر رحمت نازل کرے وہ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کرر ہے۔''(۲)

یہ آخری وقت تھا، کہ جب اپنے طرزِ عمل کا احساس ہو رہا تھا۔ طبری میں لکھا ہے کہ عام طور سے مشہور ہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات پہنچا تو انھوں نے تین مرتبہ کہا۔''**یوم لی من ابن الادبر طویل**''۔ حجر بن عدی کے قتل سے مجھے طویل روزگار کا سامنا ہے۔(۳) (حزن و مشقت کی دنیا طولانی ہوتی

---

(۱) مذکورہ بالا واقعات کے لئے ملاحظہ ہو استیعاب مطبوعہ مصر پر حاشیہ، اصابہ، ج،۱، ص، ۲۵۶، ۳۵۹۔

(۲) اصابہ، جلد، ۳، ص، ۶۵۱۔

(۳) طبری، ج،۶، ص ۱۵۶۔

ہے۔جس طرح راحت ومسرت کی مختصر، لہٰذا مقصود یہ ہے کہ مجھے بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا ہے ۔ اس قتل کے سبب سے) یہ تو حجر کا قتل تھا لیکن دوسرے نہ معلوم کتنے بے گناہ تھے جو سیاست کی تیغ بے دریغ کی نذر ہو چکے تھے۔

یہ شرط تھی معاہدہ کی جس کی تعمیل اس طرح کی گئی۔

اس کے بعد وہ شرط تھی کہ کسی کو اپنا جانشین نہ بنائیں گے۔ یہ شرط کچھ زیادہ بیان کی محتاج نہیں ہے۔معلوم ہے جو کچھ ہوا۔جانشین بنایا گیا اور کون؟ یزید ایسا فاسق وفاجر، ننگ مسلمین واسلام اور اس کی جانشینی کو مسلّم بنانے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کیے گئے۔کس طرح لوگوں سے بیعت حاصل کی گئی ۔ وہ جلسے دیکھنے کے قابل تھے جو یزید کی جانشینی کے اعلان کے لئے منعقد کئے گئے تھے۔کس طرح ان میں جبر و تشدد کا مظاہرہ تھا۔کس طرح عام افراد کے ضمیر کو سنہرے اور روپہلے سکّوں سے خریدا جا رہا تھا۔

اور یہی اسباب وذرائع تھے جن سے یزید کی خلافت کو تسلیم کرایا گیا۔

اس کے بعد یہ شرط تھی کہ ظاہر بظاہر یا مخفی طور سے کسی طرح امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے قتل کی تدبیر نہ کی جائے۔

اس شرط کی خلاف ورزی کا اظہار کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے خفیہ ریشہ دوانیوں کے لئے ثبوت بہم پہنچانا انسان کا کام نہیں ہے۔

بہرحال یہ تو تقریباً تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امام حسنؑ زہر سے شہید کئے گئے۔آپ کے قتل ہو جانے کی خبر پر شام کے قصر میں تکبیر کی صدا بھی بلند ہوئی اور اظہار مسرت بھی کیا گیا۔

اس سے زیادہ کہنا میری ذمہ داری کے خلاف ہے۔خفیہ باتیں کھل جائیں تو وہ خفیہ کب رہیں۔قرائن کی دنیا میں بے شک وسعت ہے لیکن اس کے لئے طولِ کلام کی ضرورت ہے۔

بہرحال شرائطِ معاہدہ پامال ہوئیں اور کسی ایک شرط پر بھی عمل نہ ہوا۔

بھارت اور مجلس وماتم

شاعر اہلبیت علامہ نجم آفندی

ہندو بھی ہیں غمخوار حسینؑ ابن علیؑ کے
کب اسکے غم ودرد کا بادل نہیں گر جا
بھارت کی زمیں مجلس و ماتم کا ہے مرکز
سب اسکے عزادار ہیں راجا ہوں کہ پرجا

❁❁❁

التماس ترحیم

مومنین کرام سے گزارش ہے کہ ایک بار سورۂ حمد اور تین بار سورۂ توحید کی تلاوت فرما کر جملہ مومنین مرحومین خصوصاً **مرزا محمد اکبر ابن مرزا محمد شفیع و حسن جہاں بنت باقر علی خاں** کے ارواح کو ایصال فرمائیں۔

محمد عالم

نکّر پرنٹنگ اینڈ بائنڈنگ سینٹر حسین آباد، لکھنؤ

Mohd. Alim

Proprietor

Nukkar Printing & Binding Centre

26-Shareef Manzil, J. M. Road,
Husainabad, Lucknow-3
0522-2253371, 09839713371
e-mail: nukkar.printers@gmail.com